اقبال کا نظریۂ خودی اور بیخودی

فہمیدہ کبیر صاحبہ ایم۔ اے۔ (علیگ)

اقبال کو فلسفی شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے اُردو شاعری کو ایک فلسفیانہ فکر عطا کی۔ فلسفیانہ شاعری سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے متعلق ان کا ایک خاص نظریہ اور ایک منظم و مربوط طرزِ فکر ہے جسے شاعری کا آب و رنگ دیکر انھوں نے ہمارے سامنے پیش کیا۔ ان سے پہلے یہ اندازِ فکر اُردو شاعری میں نظر نہیں آتا۔

زندگی کے متعلق حکمائے سلف نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ مثلاً افلاطون اور ارسطو دونوں کے نزدیک زندگی کی بنیادی حقیقت عقل ہے۔ عمل کو وہ ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ اقبال کے نظامِ فکر میں عمل کو فوقیت حاصل ہے۔ تسخیر و تخلیق کو وہ اصل مقصدِ حیات بتاتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق سکون سے زندگی کا تماشا کرنے سے زندگی کی ماہیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ تسخیر و تخلیق کا عمل بغیر جذبۂ خودی کے تکمیل پذیر نہیں ہوتا۔ اس لیے خودی کا فلسفہ ان کے نظریۂ حیات کا محور ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جان لینا مناسب ہے کہ اس تصور تک ان کی رسائی کن راہوں سے ہوئی۔

اقبال کے یہاں شروع ہی سے تلاش و جستجو کا ایک جذبہ ملتا ہے۔ انھوں نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گرد ایک زوال پذیر ماحول پایا۔ اس کے اسباب کا پتہ لگانے کے سلسلے میں عام طور پر قوموں کے عروج و زوال کا تنقیدی جائزہ لیا۔ بالآخر اس نتیجے پر پہونچے کہ قوموں کا زوال حکومت کے جانے سے نہیں ہوتا بلکہ تعیش اور کاہلی، مذہب و اخلاق کی بنیادی اقدار کو صدمہ پہونچاتی ہے اور اسی سے ذوقِ سعی و عمل میں تباہ کن اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی

حکومتوں کے زوال کی بنیادی وجہ ہے۔ اقبال کا عہد بھی اسی جمود کا شکار تھا۔

یہ روحانی تعیش اور بے عملی دراصل وحدت الوجود کے عقیدے سے ظہور میں آئی جو اقبال کے نزدیک غیر اسلامی اثرات کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ نظریہ شیخ محی الدین ابن عربی نے تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ یہ عقیدہ چونکہ نفیٔ ذات پر زور دیتا ہے اس لیے مسلمان رفتہ رفتہ ذوقِ عمل سے محروم ہو کر جمود کی اس منزل تک پہنچ گئے جہاں سعیٔ و عمل کی قوتیں شل ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے اس جمود کے خلاف آواز بلند کی اور قوم کو عمل کا پیغام دیا۔ پیامِ مشرق کے دیباچے میں کہتے ہیں۔ "زندگی اپنے گرد و پیش کوئی انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا کوئی خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔" اس ذہنی انقلاب کو وجود میں لانے کے لیے ضرورت تھی مسلسل جدّ و جہد اور عمل و پیکار کی جس کی تکمیل جذبۂ خودی کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ انھوں نے خودی کا فلسفہ پیش کیا جو نظریۂ وحدت الوجود کا ردِّ عمل ہے۔

اس فلسفے کے متعلق اسرارِ خودی کے دیباچے میں کہتے ہیں۔ "خودی کا سرگم کائنات ہستی کے ہر ذرّے میں نمایاں ہے۔ لیکن اس کا انتہائی کمال انسان کی ذات میں ظاہر ہوتا ہے۔" تصوف کے اثر سے خودی کا لفظ غرور و تکبر کے ہم معنی خیال کیا جانے لگا تھا۔ اقبال نے اس کو ایک وقار بخشا اور پہلے پہل تعین ذات اور عرفانِ نفس کا مفہوم اس سے وابستہ کیا۔

اقبال کے یہاں خودی کا تصور حقیقت میں قرآنِ کریم کے نیابتِ الٰہی کے تصور سے مختلف نہیں۔ انھیں نفسِ انسانی میں ایک زوالِ ناآشنا اور ارتقا کوش حقیقت کا احساس ہوتا ہے اسی کو وہ خودی سے تعبیر کرتے ہیں ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات

خودی کو اپنے استحکام و بقا کے لیے عشق کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ اقبال نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اُردو شاعری کی قدیم اصطلاحات

ہی استعمال کی ہیں لیکن ان کے یہاں انھوں نے نیا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ لفظِ عشق بھی ان کے یہاں جذبۂ تخلیق وارتقا سے عبارت ہے۔ اقبال کے خیال کے مطابق عشق کو خودی سے اور خودی کو عشق سے استحکام حاصل ہوتا ہے۔ عشق ہی سے انسان کے دل میں آرزو اور جد جہد کی لگن پیدا ہوتی ہے جو خودی کے بقا کی ضامن ہے۔ ان کے نزدیک بقا اور ارتقا کے اس میلان کا نام عشق ہے۔ جو ہر قدم پر ایک نئے مرحلے سے دوچار ہونا چاہتا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ان کے نظامِ فکر میں عشق وخودی دو مترادف الفاظ بن گئے ہیں۔ عشق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان پر اس کی خودی کو آشکار کر کے اسے اپنے وجود کی تخریبی قوتوں پر فتح پانے کے قابل بناتا ہے۔ نظریۂ خودی کے تحت انسان بھی خالق ہے۔ آرزو اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دیتی ہے اور عشق اس آرزو کو زندہ اور بیدار رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال رومی کے ہمخیال ہیں جن کے نزدیک تمام کائنات ایک ضرورت کے تحت وجود میں آئی۔ اگر انسان آرزو کو فنا کر دے تو ارتقا اور تکمیلِ حیات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

آرزو کو اپنی تکمیل کے لیے جس مسلسل حرکت اور عملِ پیہم کی ضرورت ہے وہ عشق کے سبب سے ظہور میں آتا ہے۔ یہی عشق جو دراصل عشقِ الٰہی ہے نظریۂ خودی کا مرکز ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وحدت الوجود کے فلسفے کی بنیاد بھی تو عشقِ الٰہی ہے۔ پھر اس فلسفے سے اقبال کا اختلاف کن بنیادوں پر ہے۔ اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ عشق اگر وصال کی منزل تک پہونچ جائے تو آرزو کا خاتمہ ہو جاتا ہے جس کا وجود جذبۂ عمل کو بیدار و برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، خدا نے اس کائنات کی تخلیق ایک خاص مقصد کے تحت کی ہے۔ انسان کی ہستی کائنات میں ایک اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہے اسی مناسبت سے اس کا مقصدِ حیات بھی ارفع واعلیٰ ہے۔ اگر زندگی کا یہی مقصد ہوتا کہ وہ دنیا میں آکر اپنی ہستی کو پھر اپنے خالق کی ہستی میں ضم کر دے تو پھر کائنات کی تخلیق بے معنی ہو جاتی ہے۔ اور یہ کسی طرح

بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خدا کا کوئی فعل خالی از مصلحت ہے۔ اس لیے اقبال کے نزدیک حیاتِ انسانی کا مقصد آرزوئے وصال ہے وصال نہیں۔ یہ آرزو انسان کو تسخیرِ کائنات پر مجبور کرتی ہے جس کے لیے ہمہ وقت سرگرمِ عمل رہنا ضروری ہے۔ اقبال عشق میں وصال پر فراق کو ترجیح دیتے ہیں ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

فلسفۂ وحدت الوجود وصالِ محبوب پر زور دیتا ہے۔ یہی بنیادی وجہ ان کے اختلاف کی ہے۔

جدوجہد کا مقصد غیرِ خود کی تسخیر کرنا ہے جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک وسیع خلیج کی صورت میں حائل ہے۔ اقبال ان تمام قوتوں کو جو تکمیلِ خودی کی راہ میں حارج ہوں غیرِ خود سے تعبیر کرتے ہیں۔ خودی کا ارتقا غیرِ خود کے مسلسل تصادم و پیکار سے عمل میں آتا ہے۔ اس تصادم کی دو صورتیں ہیں داخلی اور خارجی۔ داخلی تصادم وہ ہے جس میں انسان اپنے نفس کی تخریبی قوتوں کو زیر کرنے کے لیے ان سے نبرد آزما رہتا ہے۔ خارجی تصادم مراحلِ کائنات کی تسخیر کا نام ہے۔ عشق ان خلیجوں کو عبور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جس نسبت سے انسان غیرِ خود پر فتح پا کر اپنی خودی کی تکمیل کرے گا اسی نسبت سے اس کا درجہ مدارجِ حیات میں بلند ہوگا۔ اقبال خودی کی ماہیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

نئے نئے مقاصد کی تکمیل اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں غیرِ خود کی تسخیر کا راز پنہاں ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ یہ کائنات انسانی خودی کا مظہر ہے۔ انسان کو اس لیے

خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے کہ وہ اپنے خالق کی خودی کو تسلیم کرتے ہوئے اس تک پہونچنے کی کوشش کرے۔ اس کوشش کا انحصار احکامِ ایزدی کی تعمیل اور اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل پر ہے۔ ان کے یہاں انسان کی خودی کی آخری منزل فنا فی اللہ ہونا نہیں "یزداں گیری" اقبال نے خودی کے تین مدارج قرار دئے ہیں۔ اطاعتِ الٰہی، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔ خودی میں تعمیری اور تخریبی دونوں قوتیں ہیں۔ وہ اطاعتِ الٰہی اور ضبطِ نفس کے مدارج کو خودی کے ارتقا میں ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان سے گزر کر انسان اپنے نفس کی تخریبی قوتوں پر فتح حاصل کرتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال خودی کی سرکشی کے قائل نہیں انھیں مدارج سے گزر کر انسان نیابتِ الٰہی کے درجے تک پہونچتا ہے جو خودی کی معراج ہے اقبال کے مردِ مومن کا نصب العین اسی منزل تک پہونچنا ہے۔

ابتدائی دونوں مراحل سے گزرے بغیر خودی کی تعمیری قوتیں نہیں ابھر سکتیں۔ اقبال شیطان کو بدی کی طاقت نہیں مانتے۔ ان کے خیال کے مطابق وہ خودی اور تخلیق کی وہ عظیم الشان طاقت ہے جو اطاعت کے راستے سے بھٹک کر تخریب کے راستے پر گامزن ہو گئی ہے۔ ان کے نزدیک ہٹلر کی خودی بھی ایسی خودی تھی جو اطاعت اور ضبطِ نفس کے مدارج سے نہ گزرنے کے باعث اپنی تخریبی قوت کا شکار ہو گئی۔

نیابتِ الٰہی کے تصور ہی سے اقبال مردِ کامل کے تصور تک پہونچتے ہیں۔ جو کامل خودی کا مظہر ہے۔ جہاں تک مردِ کامل کا تعلق ہے اس سلسلے میں اقبال کو نطشے سے بہت مدد ملی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نطشے کا "فوق البشر" اقبال کے یہاں "خیر البشر" کی شکل میں ملتا ہے۔ اقبال کے مردِ مومن کی تشکیل میں جلال کے ساتھ ساتھ جمال کی بھی کارفرمائی ہے۔ کیونکہ وہ قرآن کا نصب العینی آدم ہے۔ اس کے برخلاف نطشے کا Super man قوت و جلال و جبروت کا مجسمہ ہے۔ وہ خودی کی تکمیل میں اطاعت اور ضبطِ نفس کے مدارج سے نہیں گزرتا۔ اقبال کا مردِ مومن خدا کی مرضی کا تابع ہے اس لیے اس میں "قاہری

بادلبری اور دلبری باقاہری، کی شان نظر آتی ہے۔

اقبال نے سب سے پہلے خودی کے مضمون کو اسرارِ خودی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بانگِ درا میں "شمع و شاعر" کے بعد اس طرف اشارے ملتے ہیں۔ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ وغیرہ میں خودی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بالِ جبریل میں خودی کا تصور انھیں اس قدر عزیز ہے کہ اس کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔ اس سلسلے میں "ساقی نامہ" بہت اہم ہے جس میں خودی کی ابتدا، ارتقا اور انتہا کے متعلق بڑے دل نشین انداز میں خیالات یکجا کیے ہیں۔

خودی کے فلسفے کو اقبال کی شاعری کے تہذیبی اور تمدنی پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب فرد کی اہمیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہو رہا تھا یہی احساس اقبال کے یہاں فلسفۂ خودی کی صورت میں سامنے آیا۔

خودی کے ساتھ ہی اقبال کے یہاں بے خودی کا تصور بھی ملتا ہے۔ خودی کا ایک پہلو انفرادی ہے دوسرا اجتماعی۔ انفرادی خودی جماعت کی خودی میں مل کر ایک بڑی خودی کی تخلیق کرتی ہے۔ اسی کو اقبال بے خودی کا نام دیتے ہیں۔ خودی کے انفرادی پہلو کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب افراد اپنے آپ کو ایک لڑی میں پرو لیں۔ اس طرح انفرادی خودی کی تکمیل سے اجتماعی خودی کی تشکیل ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک صرف فرد ہی کی خودی مقصود بالذات نہیں کیونکہ ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

"رموزِ بے خودی" میں فرد اور جماعت کے اسی فرق اور باہمی رشتے کو واضح کیا ہے۔

جماعت کا تصور اقبال کے یہاں بہت وسیع ہے۔ وہ ہر اس نظریے کی مخالفت کرتے ہیں جو انسانیت کے آفاقی تصور میں حارج ہو۔ بے خودی کا تصور جس میں رنگ و نسل اور وطن

کا احساس مٹ جاتا ہے بڑی حد تک اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی بڑھتی ہوئی قومیت تحریکوں کا ردِّ عمل ہے۔ ملّت کی تعریف ان کے یہاں یہ ہے ؎

با ہزاران چشم بودن یک نگاہ۔

خیال کی وحدت ملت کی سب سے بڑی پہچان ہے اور یہ خیال توحید کا عقیدہ ہے جس کے دائرے میں آکر مفلس و تونگر میں تفریق باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے اقبال جمہوریت کے تصور کے بھی خلاف ہیں جس کے پردے میں ایک مخصوص طبقہ اپنے مفاد کے لیے ہزاروں افراد کا خون بہاتا ہے۔ ان کے یہاں جمہوریت کا تصور قرآنی تصور ہے ؎

پیش قرآن بندہ و آقا یکے ست
بوریا و مسند و دیبا یکے ست

یہ ہے اقبال کے فلسفۂ خودی و بیخودی کا خلاصہ۔

دارالعلوم دیوبند کا علمی، دینی ترجمان

ماہنامہ **دارالعلوم** دیوبند

گزشتہ ۲ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ جاری ہے، کتاب و سنّت کا بہترین شارح، تعلیماتِ اسلامیہ کا ترجمان، مسائلِ عصریہ اور افکارِ جدیدہ کے متعلق اس کے محققانہ مضامین سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دارالعلوم کے دارالافتاء کے تازہ فتاویٰ، اور بزرگانِ دیوبند کے قیمتی مقالات رسالہ دارالعلوم میں ملاحظہ فرمائیے۔ سالانہ چندہ ساتؔ روپے منی آرڈر سے روانہ فرمائیے، وی، پی کی فرمائش نہ کیجئے نمونہ کے پرچہ کے لیے ۶۵ پیسے کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔

خط و کتابت کا پتہ: سیّد محمد ازہر شاہ قیصر، ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم دیوبند (یوپی)